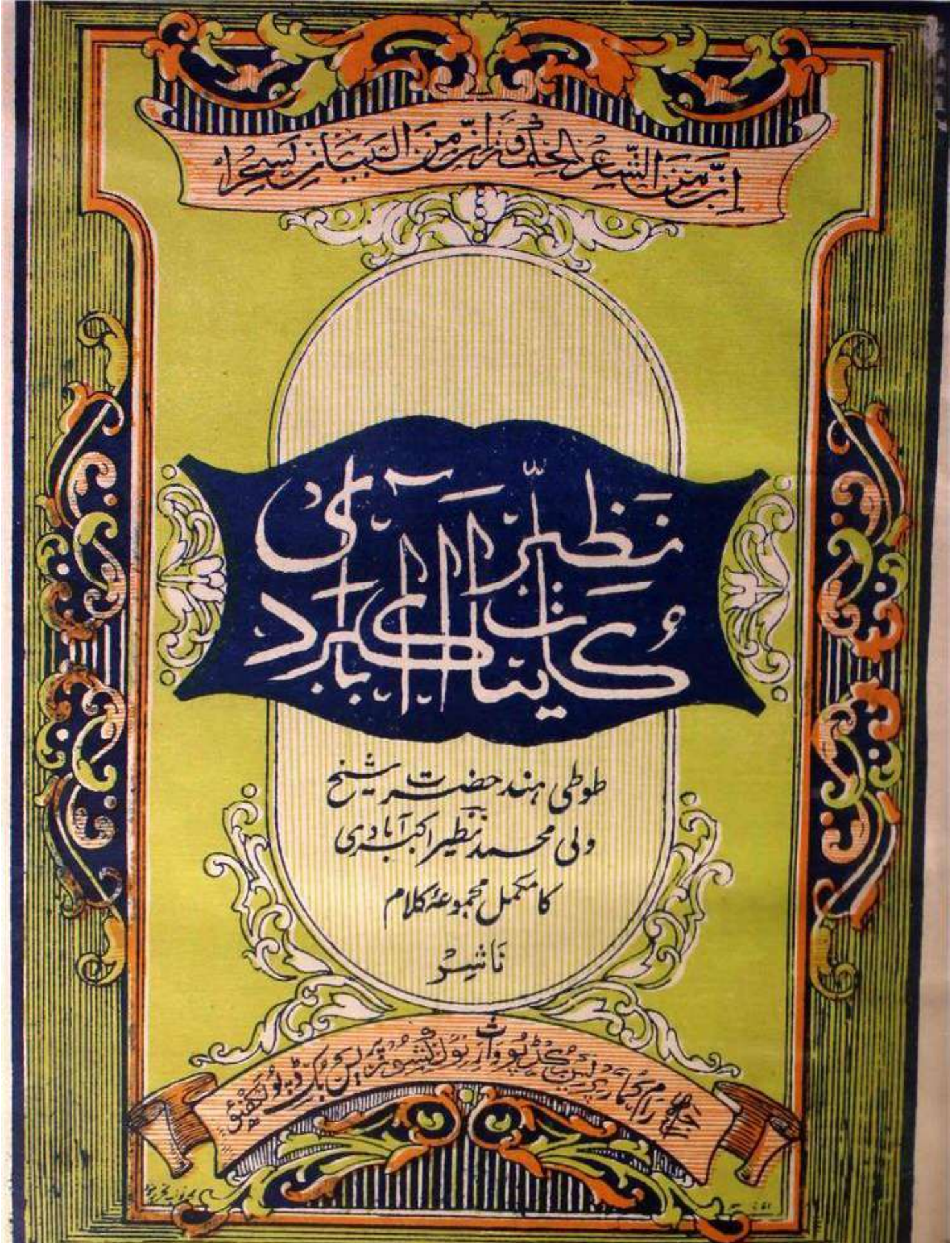

ان من الشعر لحکمة و ان من البیان لسحرا

# کلیات نظیر اکبر آبادی

طوطی ہند حضرت شیخ
ولی محمد نظیر اکبر آبادی
کا مکمل مجموعۂ کلام

ناشر

رام کمار پریس بک ڈپو وارث نول کشور پریس بک ڈپو لکھنؤ

«تیسری دفعہ» سنہ ۱۹۵۱ء قیمت مجلد [illegible]

لا يطلب ولا يباع الا في لكنه مبين

# کلیات نظیر اکبر آبادی

یعنی

شاعر شیریں مقال حضرت شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی کا
مجموعۂ کلام بہت سے مطبوعہ اور قلمی نسخوں سے مقابلہ کرکے شایع کیا گیا ہے
نظیر کی نایاب غیر مطبوعہ غزلیات اور فارسی کلام بھی شامل ہے

بتصحیح و حواشی

مولانا عبد الباری صاحب آسی
و
مولوی اشرف علی لکھنوی

(راجہ رام کمار پریس بکڈپو وارث نول کشور پریس بک ڈپو لکھنؤ)

تیسری بار ۱۹۵۱ء قیمت [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مقدمہ

اُردو شعرا میں شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی کی مثال مشکل سے ملیگی۔ ایک طرف تو ان کے ہمعصر اور مابعد کے تذکرہ نگاروں اور نقادانِ فن نے یا تو ان کا ذکر شاعر کی حیثیت سے کیا ہی نہیں، اور اگر کیا بھی تو مذمت اور ملامت کے لہجہ میں، اور انھیں محض عوام پسند اور بازاری شاعر کی سطح پر رکھا۔ دوسری طرف بعض تذکرہ نویسوں نے جن میں گلستان بے خزاں کے مؤلف قطب الدین باطن صاحب بھی شامل ہیں، نظیر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ اور پھر جدید دور کے ناقدوں اور مغربی علوم ادب سے متاثر اہل ذوق نے نظیر کو اُردو کا بہترین شاعر قرار دیدیا۔

لیکن اب اُردو ادب کی خوش قسمتی سے شاعر کے موافق و مخالف اتنا مواد فراہم ہو چکا ہے کہ افراط و تفریط سے بچ کر صحیح اور مبنی بر اعتدال رائے ظاہر کی جا سکتی ہے۔

پچھلے تذکرہ نگاروں نے تو اُن کے احوال زندگی پر توجہ ہی نہ کی تھی، خدا بھلا کرے، پروفیسر محمد عبد الغفور شہباز کا کہ انھوں نے نظیر اور کلام نظیر کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور ۴۲۵ صفحہ کی

ضخیم سوانح "زندگانی بے نظیر" (جسکے دوسرے نام خود مؤلف نے دیباچہ میں "نظیر نامہ دل آویز" اور "اکبرآباد کے نظیر کی سوانح عمری" بھی تحریر کیے ہیں) اور تقریباً گیارہ سو صفحات کا ضخیم ترکلیات نظیر شائع کرکے اُردو کی بے نظیر خدمت انجام دی، اور انھیں کی کوشش کے نتیجہ میں کہنا چاہیے کہ نظیر دوبارہ زندہ ہوے، اور آج اُردو ادب کا ہر طالب علم نظیر کے نام سے واقف اور اُن کے کلام کا معترف نظر آرہا ہے۔ بعد کے سوانح نگاروں، تذکرہ نویسوں اور ناقدوں نے نظیر کے بارہ میں مختصر یا مفصل جو کچھ لکھا اس کا اصل ماخذ بھی شہباز کی یہ مذکورہ تالیفات ہیں۔ اس کے تقریباً ۳۰ برس بعد نظیر کے ایک ہم وطن سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی نے ایک مبسوط کتاب "روح نظیر" کے نام سے لکھی۔ زندگانی بے نظیر، بڑی حد تک طرز قدیم کی کتاب ہے۔ اور "روح نظیر" عصر حاضر کے تقاضہ کو پورا کرنے والی۔ اور اس میں کلام نظیر پر تبصرہ بھی جدید معیاروں کے مطابق ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور دوسرا اڈیشن جس کی ضخامت پہلے سے بھی زائد ہے۔ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ اور ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیر اہتمام "دیوان نظیر" اکبرآبادی کی اشاعت عمل میں آئی۔ جس کے مرتب اُردو کے ادیب شہیر مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم تھے۔ دیوان کے ساتھ ان کا مبسوط و مدلل مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس میں نظیر کے کلام پر منصفانہ جنچی تلی رائیں، دہلی کی ٹکسالی زبان میں درج ہیں۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ اردو رسائل میں اب تک نظیر اکبرآبادی کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے والے مضامین بھی بکثرت نکل چکے ہیں، جن کی بدولت نظیر نہ تو اب ادب اُردو میں گمنام کہے جاسکتے ہیں اور نہ بدنام۔

## سوانح حیات

نظیر شہر دہلی میں ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوے (صرف ایک تذکرہ میں اُن کی جائے پیدائش آگرہ بتائی گئی ہے مگر اس کی تائید کہیں اور سے نہیں ہوئی) ان کے والد محمد فاروق کے بارہ اولادیں ہو کر فوت ہو چکی تھیں، نظیر کا نمبر تیرھواں تھا۔ مشہور ہے کہ کسی فقیر کی دعا سے یہ زندہ رہے۔ اور نظر بد سے تحفظ کے لیے بچپن میں ان کے ناک کان چھید کر انکی ظاہری وضع بالکل لڑکیوں کی سی بنا دی گئی تھی۔

حضرت شہباز اس واقعہ کو اپنی مرصع عبارت میں یوں لکھتے ہیں:-

"فقیر نے بشارت دی کہ جا خوش ہو، ایک لڑکا تیرا زندہ ہوگا، زندہ رہے گا اور تیرے نام کو زندہ کرے گا، قابلیت اس کی غنچہ کی طرح شگفتہ ہوگی، اور خوشبو اس کی پھول کی طرح تمام پھیلے گی۔ ...... نویں مہینے میاں نظیر دبستانِ عدم سے مکتبِ ظہور میں آئے۔ چونکہ کئی اولادوں کو مار کر ہوئے تھے، جرم سنگین تھا، لہذا ناک کے ساتھ دونوں کان بھی چھید دیے گئے۔ اس سزا پر معصوم آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ بطور عذرِ گناہ، خوش تر از گناہ، ناک میں بلاق ڈالا گیا، کانوں میں دُر لٹکے۔ بلاق نے نتھنوں سے سرگوشی شروع کی، دُر نے خدا جانے کانوں میں کیا پڑھ کر پھونکا۔ زینت دے اُڑی، بھولا پن منہ دیکھتا رہ گیا۔" (صفحہ ۹)

نظیر نے بڑے پر آشوب زمانہ میں ہوش سنبھالا۔ اولاً نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں محمد شاہ رنگیلے کی دہلی کو تاراج کر چکا تھا، احمد شاہ ابدالی کے تین حملے ۱۷۴۸ء سے لے کر ۱۷۵۷ء تک ہوئے اس لیے نظیر اپنی ماں اور نانی کے ساتھ ۲۲-۲۳ سال کی عمر میں ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور آگرہ میں مٹھائی کے پُل کے پاس رہنے لگے۔

دہلی میں نظیر کا عہدِ طفولیت اور نوجوانی بڑی ہنسی خوشی گزرا۔ ماں باپ نے بڑے ناز و نعم میں پالا۔ ہر قسم کی تفریحات میں دل کھول کر حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بچپن کے کھیل تماشوں، تہواروں وغیرہ کی جو تفصیل ملتی ہے وہ اُردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ مثلاً دیوالی کے تہوار کا ذکر ملاحظہ ہو:-

مٹھائیوں کی دکانیں لگا کے حلوائی ۔۔۔ پکارتے ہیں کہ "لالہ دوالی ہے آئی"
بتاشے لے کوئی، برفی کسی نے تلوائی ۔۔۔ کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی
گویا انھوں کے واں راج آگیا دوالی کا

اب ذرا شبِ برات کا گرما گرم نقشہ ملاحظہ ہو:-

آگر کسی کے سر پہ چھچھوندر لگی کرڑی — اوپر سے اور ہوائی کی آگر پڑی چھڑی
ہو گئی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی — پاؤں سے لپٹی شور مچا کر قلم زڑی

کرتی ہے پھر تو ایسی ستمگاری شب برات

اس زمانہ میں فٹ بال، کرکٹ، ہاکی، ٹینس، سینما، سرکس وغیرہ کا تو کوئی نام بھی نہ جانتا تھا، ان کی جگہ کبڈی، پتنگ بازی، شطرنج، گنجفہ، کبوتر بازی وغیرہ کا چلن تھا، میاں نظیر ان سب میں نوجوانی میں طاق تھے، پتنگ کے پیچ کا ذکر سنتے چلیے:۔

اگر پیچ پڑ گئے تو یہ کہتے ہیں "دیکھیو — رہ رہ کے اس طرح سے نہ اب دیجے ڈھیل کو
پہلے تو یوں قدم کے تئیں او میاں رکھو — پھر ایک رگڑا دے کے ابھی اسکو کاٹ دو

ہے گا، اسی میں فتح کا پانا پتنگ کا"

کبوتر بازی سے اپنی دلچسپی کا ذکر یوں کیا ہے:۔

چھوڑ ان کو نظیر اپنا دل اب کس سے لگاویں — اپنے تو لڑکپن سے ہیں دمساز کبوتر

ایک اور جگہ اس سلسلہ کی بلند پروازی ملاحظہ ہو:۔

تاروں کے وہ انداز نہیں بام فلک پر — جو کرتے ہیں چھتری کے اُپر ناز کبوتر

دہلی سے جب آگرہ منتقل ہوئے تو وہاں بھی سیر و تفریح نے ساتھ نہ چھوڑا، وہاں ہر سال برسات میں پیراکی کا تماشا ہوتا تھا۔ نظیر کے سے غواص سخن کی روانی طبع اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو:۔

کچھ ناچ کی بہاریں، پانی کے کچھ تاڑے — دریا میں مچ رہے ہیں، اندر کے سو اکھاڑے
لب ریز گل رخوں سے دونوں طرف کراڑے — بجرے و ناؤ چھوڈ ڈونگی بنے نواڑے

ان جھگھٹوں سے ہو کر سرشار پیرتے ہیں

نظیر کے کلام ہی سے اخذ کر کے پروفیسر شہباز نے انکی تعلیم کا پورا نقشہ کھینچ دیا، یوں انکی بسم اللہ ہوئی، یوں انھوں نے ماہ ڈیڑھ ماہ میں بغدادی قاعدہ ختم کیا، اُستاد کو قاعدہ کی ختم کرائی کا انعام ملا۔ پھر پارہ عم شروع ہوتے وقت فاتحہ ہوا، مٹھائی تقسیم کی گئی۔ اس کے بعد شیخ سعدی کی "کریما"

شروع کرائی گئی اور اس کے ساتھ ہی ہونہار بچے کی موزونیت اور روانی طبع کے جوہر بھی کھلنے گئے۔ فارسی کی دوسری ابتدائی درسی کتابوں کا نامقیماں، خالق باری، آمد نامہ، محمود نامہ، عطائی نامہ کا نمبر اسکے بعد آیا۔ اس کے بعد گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ، انشائے خلیفہ، طاہر وحید انشاء منیر، یوسف زلیخا، ابوالفضل، سہ نثر ظہوری، قصائد عرفی و خاقانی وغیرہ درسیات فارسی ختم کرائی گئیں، عربی تعلیم کچھ یوں ہی سی رہی، لیکن فارسی پر خوب اچھی طرح عبور ہوگیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نظیر آٹھ زبانوں عربی، فارسی، اُردو، پنجابی، بھاشا، ماڑواڑی، پوربی اور رمبدی سے واقف تھے۔ اور ان کے کلام میں ان سب زبانوں کے الفاظ اور محاورے کثرت سے ملتے ہیں۔ شہباز صاحب لکھتے ہیں:۔

"اُردو چونکہ ہر زبان کو مہمان نوازانہ اپنے کاشانہ میں جگہ دیتی ہے اس لیے جو شخص اُردو میں کمال پیدا کیا چاہتا ہے، وہ گویا بالطبع اور کئی زبانوں کی تحصیل پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی مجبوری اور کچھ طبیعت کی رنگینی کی وجہ سے نظیر نے اپنی توجہ کو مختلف زبانوں کے حاصل کرنے کی طرف مصروف کیا۔ وہ تھوڑے زمانہ میں پنجابی خاصی طرح بولنے لگا۔ برج بھاشا پر اس نے گوپ اور گوپیوں کی سی مہارت حاصل کی۔ پوربیوں کا لہجہ اخذ کیا، ماڑواڑیوں کی اصطلاحیں یاد کیں۔ ملک محمد جائسی کی بھاشا میں، یا وہ جو تلسی داس کی ہے، اُس میں کمال پیدا کیا..... اُسکی ٹھیک تعیین نہیں ہوسکتی کہ نظیر نے یہ غیر زبانوں میں کمال کس زمانہ میں حاصل کیا تھا۔ پنجابی چونکہ دہلی میں اکثر لوگ پنجاب کے بسے ہوئے ہیں، ..... غالباً اس کو لڑکپن ہی میں معلوم ہوگئی ہوگی۔ لیکن اور زبانیں خصوصاً سنسکرت غالباً اس نے بعد فراغ مکتب سیکھیں"۔

ان کے کلام میں خمسہ ہفت زبان بھی موجود ہے جن سے ان زبانوں میں ان کی مہارت تامہ کا تو نہیں البتہ ان کی ذہانت، جودت وجدت طبع کا ضرور پتہ چلتا ہے۔

خوشگوئی کی طرح خوشنویسی میں بھی نظیر نے مہارت حاصل کی تھی۔ شہباز صاحب نے اُنکے ہفت زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ہفت قلم ہونے کا بھی احتمال ظاہر کیا ہے۔ فن سپہ گری میں بھی نظیر دخل رکھتے تھے، بڑھاپے تک ورزش کا معمول ترک نہیں ہوا، اور نہ شاعری میں پہلوانی کے کس بل رخصت ہوے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اے یار سو برس کی ہوئی اپنی عمر آکر — اور جھریاں پڑی ہیں سارے بدن کے اوپر
دکھلاتے جس گھڑی ہیں میدان میں ورجا کر — رُستم کو بھی سمجھتے اپنے نہیں برابر
اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے

اُس زمانہ کے دیگر مروجہ علوم ہیئت، طب، معانی و بیان سے بھی خاص واقفیت رکھتے تھے، اور ان کے کلام میں منطق و فلسفہ، کلام و عقائد وغیرہ کی اصطلاحوں کے آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اس زمانہ کے فضلا کا فیض صحبت اچھا خاصہ اُٹھایا تھا۔

نظیر نے عمر کا بڑا حصّہ معلمی میں گزارا، شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے اُن میں حکیم میر قطب الدین باطن مؤلف تذکرہ گلستان بیخزاں[1] (المعروف بہ نغمۂ عندلیب)، شیخ مداری ضمیر۔ خود نظیر کے صاحبزادے گلزار علی اسیر۔ مہاراجہ بلونت سنگھ۔ راجہ لالہ بدھ سین صافی۔ حکیم میر مہدی ظاہر، شیخ حسین بخش بخشی، شیخ نبی بخش عاشق، منشی حسین علی خاں لیجہ، بیدار بخش لہر، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ صاحب گلستان بے خزاں نے مرزا غالب کو بھی نظیر کے شاگردان رشید کی فہرست میں داخل کر دیا ہے، لیکن یہ چیز پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتی۔ پروفیسر شہباز نے تلمذ غالب کے متعلق متضاد بیانات جمع کر کے آخری رائے یہ دی ہے کہ غالب جس زمانہ میں اکبر آباد میں مقیم تھے وہ اُنکی ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا، اور اس زمانہ میں آگرہ کے ممتاز ملاؤں میں صرف دو ہی شخص خلیفہ معظم اور میاں نظیر تھے، غالب کو انھیں دونوں کی طرف رجوع کرنا پڑا:۔

"دو چار غزلیں بھی مکتب ہی میں نظیر کو دکھائیں۔ لڑکے (غالب) کی گاؤ زوریاں دیکھ کر ہنسی تو ان کو آئی مگر دل شکنی انکا شعار نہ تھا، واد دے کر جی بھی بڑھایا

[1] یہ تذکرہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ گلشن بے خار کے جواب میں ہے، اس پر شیفتہ اور مومن کے اُستاد حکیم مومن خاں مومن پر خوب چوٹیں کسی گئی ہیں ۱۲ اشرف علی عفی عنہ

اور اصلاح سے چپکے چپکے نشیب و فراز بھی بتایا۔ غالب کا زور یہ کہ اُردو کو بیدل کی فارسی بنادیں۔ نظیر کا طور یہ کہ بیدل کو سعدی بنادیں، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ سلسلہ اصلاح منقطع۔"

لیکن مولانا حالی، اور دیگر معتقدین غالب نے اس بیان کی سختی سے تردید کی ہے۔

نظیر کی طبیعت میں استغنا بہت تھا۔ واجد علی شاہ نے طلب کیا، نہیں گئے۔ پھر راجہ بھرت پور نے بلایا، انکار کر دیا۔ کچھ دنوں متھرا میں لڑکے پڑھانے کی نوکری کی۔ پھر آگرے میں بھاؤ قلعدار کے معلم ہوئے، اس کے بعد کچھ دنوں نواب محمد علی خاں کے بچّوں کو پڑھایا، اور اس نوکری کو چھوڑنے کے بعد راجہ بلاس رائے کے بچّوں کو ستّر روپیہ ماہوار (ایک تذکرہ میں ستّر روپیہ ماہوار درج ہے) پر پڑھایا۔

نظیر کی شادی دہلی کے ایک آدمی عبدالرحمٰن خاں چغتائی کی نواسی اور محمد رحمٰن خاں کی بیٹی تہور النسا بیگم سے ہوئی ان سے نظیر کی دو اولادیں ہوئیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکے کا نام گلزار علی اور لڑکی کا امامی بیگم۔ امامی بیگم کی صاحبزادی ولایتی بیگم ہی کی بدولت نظیر کی زندگی کے حالات، دنیا کو پہونچے ہیں۔ پروفیسر شہباز مرحوم نے انھیں سے سب حالات معلوم کیے، یہانتک کہ نظیر کے نوکروں اور ماماؤں کے نام بھی معلوم کیے۔

نظیر اکبرآبادی کی شادی کا قصّہ پروفیسر شہباز نے یوں لکھا ہے کہ نظیر جب دہلی سے نقل وطن کر کے آگرے آئے تو اس سے پہلے ہی وہ شاعر ہو چکے تھے، آگرہ اُس زمانے میں ناخدائے سخن میر تقی میر کی شاعری اوج پر تھی۔ تمام شہر آگرہ اُن کا لوہا مانتا تھی۔

نظیر نے میر کے طرز پر ایک غزل کہی، اور اس غزل کا ذکر میر صاحب کے کانوں تک پہونچ گیا، اور انھوں نے تبسّم فرما کر ایک مربیانہ ادا سے یوں ارشاد کیا، ہاں بھئی پڑھو اور ضرور پڑھو۔

کلُّ جدید لذیذٌ۔ دہلی کے چٹخارے تو مشہور ہیں۔"

چنانچہ نظیر نے ڈرتے ڈرتے ایک بزم مشاعرہ میں جس میں میر صاحب بھی جلوہ افروز تھے، اپنی غزل

جس کا مطلع حسب ذیل ہے، پڑھی ؎

نظر پڑا اک بت پری وش زالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی، پہ قہر آفت غضب خدا کا

"ختم غزل پر میر صاحب نے قریب بلا کر پیٹھ ٹھونکی اور مکرر فرمایا عمرت دراز باد"

اس غزل کے باعث نظیر، شعرا اور سخن فہموں کے حلقے میں تورو شناس اور مقبول ہوئے ہی۔ یہ غزل اُن کی شادی کا وسیلہ بنی۔ اس شادی کی ساری رسمیں شروع سے آخر تک نظیر کے کلام میں ذرا ذرا سی جزئیات کے ساتھ موجود ہیں، پروفیسر شہباز نے ان سے فائدہ اُٹھا کر، یہی سارا نقشہ نثر میں بھی، زندگانی بے نظیر کے کئی صفحوں میں دکھایا ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"گوٹے اور پھولوں کے گہنے ایسے تھے، کہ سب بے اختیار درود پڑھنے لگے آنکھوں میں روشنی آئی۔ دماغ نے تازگی پائی۔ دوشالہ خاص کشمیر کا، ملاست میں ملائی، نرمی میں ریشم، نقش و نگار میں قلم کار چھینٹ، رومال عدد میں طاق، روئے خور کو کچھ مال نہ سمجھیں۔ تار زلف کو اگر کچھ سمجھیں تو چرخے کی مال سمجھیں۔ مردوں کو زیورات سے کیا کام۔ مگر نوشے کا ہاتھ خالی دیکھا نہیں جاتا۔ انگوٹھے کے لیے چاپ انگشتانہ ہے۔ چھوٹی انگلی کے لیے ایک مختصر سی انگشتری"

نظیر کا حلیہ اور وضع قطع حسب ذیل ہے:۔

رنگ گندم گوں، قد متوسط، پیشانی بلند اور چوڑی، آنکھیں چمکدار، ناک بلند، داڑھی خشخشی، مونچھیں بڑی۔ لباس وہی جو محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی میں رائج تھا۔ یعنی کھڑکی دار پگڑی، گاڑھے کا انگرکھا، سیدھا پردہ نئی چولی، اس کے نیچے کرتا، ایک بُرکا پاجامہ، گھیتلی جوتی، ہاتھ میں شام دار چھڑی، انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں"

خود نظیر نے اپنے بارہ میں جو لکھا ہے، اُس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہتے ہیں جسکو نظیر سنیے ٹک اس کا بیاں — تھا وہ معلّم غریب بزدل و ترسندہ جاں

فضل نے اللہ کے اُسکو دیا عمر بھر — عزت و حرمت کے ساتھ پارچہ و آب و نان
فہم نہ تھا علم سے عربی کے کچھ بھی اُسے — فارسی میں ہاں مگر جانے تھا کچھ این و آں
سُست روش، پست قد، سانولا ہندی نژاد — تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافق میاں
ماتھے پر اک خال تھا چھوٹا سا مسّہ کے طور — تھا وہ پڑا آنکھ اور ابروؤں کے درمیاں
وضع سبک اسکی تھی تپسہ نہ رکھتا تھا ریش — مونچھیں تھیں اور کانوں پہ لٹکی تھے پنبہ ساں
پیری میں تھی جس طرح اُسکو دل افسردگی — ویسی ہی تھی اُن دنوں جن دنوں میں تھا جواں
لکھنے کی یہ طرز تھی کچھ جو لکھے تھا کتاب میں — پختگی و خامی کے اسکے تھا خط درمیاں

سنہ ۱۲۴۲ھ میں نظیر پر فالج کا حملہ ہوا لیکن اس سے سنبھل گئے۔ سنہ ۱۲۴۶ھ میں اس مرض کے اثر سے داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مکان کے صحن میں شمال کی جانب نیم اور بیر کے دو درخت تھے، انھیں کے نیچے بوریے پر بیٹھ کر بچوں کو پڑھاتے، اور وہیں دوست اور شاگردوں سے ملاقات کرتے۔ غزلوں پر اصلاح دیتے، اور اپنا کلام بھی سناتے۔ یہی گویا اس مرد فقیر کا دیوان خانہ (ڈرائنگ روم) تھا، وفات بھی انھیں درختوں کے تلے پائی اور مدفن بھی وہیں بنا۔

باب فاروقی

نظیر مذہباً شیعہ تھے یہ اُن کی نواسی کی روایت ہے۔ اور اُن کے کلام کے تتبع سے بھی یہی نظر آتا ہے، حضرت علیؓ کے معجزات و منقبت والے اشعار اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں مذہبی تنگ نظری اور تعصب کا پتہ نہیں وہ صوفی منش اور عقیدہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ بزرگان دین سے گہری عقیدت رکھتے تھے، سُنّی بزرگ مثلاً شیخ سلیم چشتی رح وغیرہ کی شان میں اُن کا کلام اُن کے حسن عقیدت کا مظہر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر مذہب والا اُن کو اپنے میں شامل کہتا تھا۔ ان کی وفات پر سنیوں اور شیعوں دونوں نے اپنے اپنے طریقے پر نماز جنازہ ادا کی، اور جنازے کی چادر اُن کے ہندو شاگرد بتر گائے گئے۔ شاگردوں ہی نے اُن کی قبر پختہ بنوائی۔ ہندو شاگردوں نے سوئم کے دن قبر پر میلہ کیا اس سلسلہ میں

غلام رسول کی مسجد میں قرآن خوانی بھی ہوئی۔ قبر اب بھی موجود ہے۔ مگر لوح مزار غائب ہو چکی ہے۔ انتقال کی تاریخ اس مصرعہ سے نکلتی ہے ؎

مخمس بے سر و پا، بیت بے دل، فرد بے سر شد

نظیر کے عادات و اخلاق کی سب ہی نے تعریف و توصیف کی ہے۔ ان کے کلام کے اُس حصہ کو چھوڑ کر جو شاید ان کی جوانی کا کلام ہے، اور جس میں شوخی و رندی نمایاں ہے، باقی کلام سے ان کے بہترین اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ طبعاً آزاد اور روادار تھے، تمام عمر نہ کسی کی مدح سرائی کی نہ ہجو سے اپنی زبان و قلم کو گندہ کیا۔ ہر شخص سے بکشادہ پیشانی ملتے۔ خلافِ مزاج باتوں پر بھی برہمی کے آثار چہرے سے ظاہر نہ ہوتے۔ اُن کی خوش مذاقی ہر انجمن کو شگفتہ بنا دیتی۔ حاجتمندوں کے ساتھ اپنی حیثیت سے بڑھ کر سلوک کرتے اور حتی الامکان کسی سائل کو اپنے دروازے سے خالی نہ واپس کرتے۔ دوستی کا پاس و لحاظ صد درجہ کرتے۔ بچّوں، جوانوں، بوڑھوں سب ہی سے بے تکلف بات چیت کرتے۔

حضرت شہباز نے ان کے کلام سے ایسے نمونے نکال کر دکھائے ہیں جن سے ان کے اعلیٰ اخلاق کا پتہ چلتا ہے، نظیر نے یہ اشعار محض زبان سے نہیں کہے، زندگی بھر اُن کا عمل بھی انھیں پر رہا، شاعر بے عملی کے لیے مشہور ہیں، نظیر جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے جو کہتے تھے وہی کرتے تھے۔ بخل کی مذمت اور سخاوت کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

دولت جو ترے پاس ہے رکھ یاد تو یہ بات
کھا تو بھی، اور اللہ کی کر راہ میں خیرات
دینے سے اس کے ترا او نچا رہے گا ہات
اور یاں بھی تری گزرے گی سو عیش سے اوقات
اور واں بھی تجھے سیر یہ دکھلائے گی بابا

داتا کی تو مشکل کوئی اٹکی نہیں رہتی
چڑھتی ہے پہاڑوں کے اوپر ناؤ سخی کی
اور تو نے بخیلی سے اگر جمع اسے کی
تو یاد یہ رکھ بات کہ جب آوے گی سختی
خشکی میں تری ناؤ یہ ڈبوائے گی بابا

نظیر کی نواسی کا حسب ذیل بیان زندگانی بے نظیر میں درج ہے:۔

"نانا جان بڑے ہی سخی مزاج کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے تمام عمر اپنے ہاتھ سے روپیہ نہیں چھوا، جہاں کہیں سے روپیہ آیا، روپیہ لانے والے سے کہا کہ اسکو رومال میں باندھ دو۔ پھر اس رومال کا ایک سرا پکڑ کر جیسے کوئی نجس چیز ہو، گھر میں ڈال جاتے، یا کسی آدمی سے کہتے کہ گھر بھجوا دو۔ نانی کا جس طرح جی چاہتا، خرچ کرتیں۔ وہ پوچھتے بھی نہیں کہ کیا ہوا اور کدھر گیا۔"

مال و دولت سے ان کی بے نیازی اور فقیر منشی کا ثبوت اس حکایت سے بھی ملتا ہے کہ لکھنؤ کے نواب (غالباً واجد علی شاہ) نے اُن کے کلام کا شہرہ سن کر بلا بھیجا، اور قاصد کے ہاتھ تین ہزار روپیہ بھی بھیجا۔ روپیہ نظیر نے لے کر گھر میں رکھا اور قاصد سے کہا کہ اپنے فیصلہ سے میں کل مطلع کروں گا۔ لیکن رات بھر روپیہ کی حفاظت کے خیال سے سو نہ سکے۔ صبح ہوتے ہی قاصد سے کہا کہ بھائی یہ روپیہ تو بڑے بکھیڑے کی چیز ہے۔ چور کے ڈر کے مارے میری تو رات بھر اُدھیڑ بن میں گذری کہ نیند حرام ہوگئی۔ سو مجھ کو ایسی چیز لینی منظور نہیں آرام سے اپنا سوتا ہوں اور شکر خدا بجا لاتا ہوں۔ اپنی ایسی عمدہ عافیت کو میں اتنے روپے کے لیے بیچ نہیں سکتا۔

پروفیسر شہباز نے اس واقعہ کے متعلق اُن کی نواسی سے دریافت کیا تھا، انھوں نے بتایا کہ ہاں لکھنؤ کے نواب نے بلا بھیجا تھا، لیکن اُنھوں نے کہا کہ میں ماشہ بھر کا قلم ہلانے والا میاں کدھر جاؤں۔ امیروں کے لائق کہاں ہوں۔ یہی کہہ کر ٹال دیا اور نہ گئے۔

اُن کے اخلاق جمیلہ کی تعریف اُردو کے قدیم مستند تذکرہ نگار ابو القاسم میر قدرت اللہ قدرت نے یوں کی ہے:۔

"شیخ ولی محمد اکبر آبادی شاعر بے ہمت دیرینہ مشق کہ بالفعل دراں نواح علم اُستادین می افرازد و نزد محبت و اخلاص باہر کسے می بازد، بسیار سلیم الطبع و

خوش اختلاط، و نہایت نیک طینت؛ و مستحکم ارتباط شنیدہ می شود۔ بہ معلّمی اوقات گذراں می کند و بکشادہ پیشانی ایام زندگی بسر می بَرد۔"

تذکرہ گلستاں بے خزاں کے مؤلف میر قطب الدین باطن نے اُن کے اخلاق و اطوار کے بارہ میں بہت کچھ لکھا ہے، اور یہ اُس زمانہ کی مروّجہ مقفیٰ و مسجّیٰ انشاء ہے، چند فقرے ملاحظہ ہوں:۔

"پیر مغاں میکدۂ سخن، جرعہ کش رادقِ مضامین نو و کہن، جناب سید ولی محمد نظیر۔ لعل معدن حلم و حیا، گوہر گنج اتقا، خورشید آسمانِ وفا، ماہِ چرخ صفا؛ ..... مخزن جود و احسان، معدنِ الطاف بے پایاں، حلیم الطبع، خلیق الوضع..... حریف محفل آشنائی، ظریف انجمن دانائی..... چرخ ہمت زمین حلم، دور از جہل نزدیک بعلم، وحید عصر یکتائے زماں، رفیع مرتبت، بزرگ شوکت، والا فطرت، اوج فتوت۔"

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں ان کی شاعری کے بارہ میں کوئی اچھی رائے نہیں ظاہر کی، لیکن اخلاق و عادات کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ لکھتے ہیں:۔

"گویند کہ نظیر در حلم و خلق و انکسار بے نظیر روزگار است۔"

سعادت خاں ناصر صاحب تذکرہ جوش معرکہ کی رائے حسب ذیل ہے:۔

"نظیر وضع قلندرانہ، مرد آزاد۔ معاش اس کی تعلیم صبیاں اور اُجرت صدائے فقیراں۔"

اُردو کے مشہور قدر داں اور ناقد سخن ڈاکٹر فیلن نے نظیر کے حق میں اتنا زیادہ لکھا ہے کہ کسی مغربی اہل قلم سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

"اُس کی نظمیں، آپ اُس کی سوانح عمری ہیں۔ کیونکہ قالب نظم میں یہ شخص اپنی تمام ذاتی خصوصیتوں کے جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ اور سامان نہ سہی، فقط انھیں نظموں سے اُسکی تصویر کے بعض خط و خال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ حقیقت میں آزاد بے نوا تھا، اور یہی وہ اپنے تئیں بتاتا بھی تھا۔ وہ اصل میں دنیا سے بے تعلق صوفی تھا۔ جس کا اوروں کو

صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ وہ تقدیر کی نہ موافقت کی پروا کرتا تھا نہ مخالفت کی، وہ کچھ چاہتا ہی نہ تھا۔ وہ نہ کسی مرد کی پروا کرتا تھا نہ کسی عورت کی۔ عورتوں سے اگر مطلب تھا تو صرف اتنا کہ دور سے اُن کے حسن صورت پر عش ہوئے۔ نہ اقبال سے پھولتا تھا، نہ ادبار سے ڈول ہوتا تھا، جب کہ اُس نے خود لکھا ہے "وہ اپنی کھال میں مست تھا" اس نے کبھی اپنی کسی تحریر کو حفاظت سے رکھنے کا خیال نہ کیا۔ اُس کی نسبت لوگ روایت کرتے ہیں کہ اُس کا معمول یہ تھا کہ نظم لکھی اور لکھ کر پھینک دی، شاگرد یا دوست جن کے لیے وہ لکھی، اُٹھا کر لے گئے..... نظیر طبیعت (فطرت) اور ہر قسم کی انسانیت کے ساتھ ایک گہری ہمدردی رکھتا تھا، وہ ہر چیز کی خوبی پاتا تھا۔ وہ خوش ہے جب گروہ کا گروہ خوش ہے، اُن کے کھیل تماشوں سے مزا لیتا ہے، وہ ان کی مصیبتوں سے دُکھ پاتا ہے۔ صرف یہی ایک شاعر ہے جس کو غریبوں، مفلسوں، بیکسوں، مصیبت زدوں اور سب سے کس مپرس خدا کی مخلوق کے ساتھ جوش ہمدردی ہے، جب کہ اس نے اس مضمون کو نہایت عمدہ طور سے اپنی اُس عمدہ نظم کے مقطع میں ظاہر کیا ہے، جو اس نے آدمی نامہ کے نام سے انسان پر لکھی ہے:۔

اچھے بھی آدمی ہی کہلاتے ہیں اے نظیر — اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر بے ثباتی عالم کے دل سے قائل تھے، اس لیے ان کے کلام میں عبرت و موعظت کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں، اُن کا یہ عبرت آگین قطعہ تو اُردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے:۔

تن مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا — گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا — مشیّن بدن تھا، معطر کفن تھا
جو قبر کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا — نہ عضو بدن تھا، نہ تارِ کفن تھا
نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی — جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

یہ اوپر بتایا جا چکا کہ نظیر بزرگان دین کے سچے ارادت مند تھے، صوفیاء کے فیض صحبت سے

اُن کے آئینۂ دل پر بھی جلا ہو گئی تھی، کلام میں تصوّف کے اثرات کثرت سے نمایاں ہیں، لیکن دقیق و غامض مسائل میں نہایت آسان عام فہم اور عوام پسند زبان میں ادا کیا ہے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا، محض "قال" نہیں "حال" ہے، ہر قسم کے شاعرانہ غلو و مبالغہ سے خالی۔ شہباز صاحب، نظیر کے اس رنگ طبیعت پر ذیل کی رنگین عبارت لکھتے ہیں:۔

"صوفیوں میں بیٹھتے بیٹھتے اُس پر عام جلوۂ باری کی حقیقت روشن ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ وحدت الوجود کا آفتاب کس طرح ہر ذرّہ کے مطلع سے چمک رہا ہے۔ اس یقین کے ساتھ بھی اس کی زبان گستاخ نہیں۔ وہ ادب کے قرینے ملحوظ رکھتا ہے۔ منصور کی طرح انا الحق کے شور سے توحید کی روئی نہیں دُھنکتا۔ عرفان کی عینک چڑھی ہوئی ہے۔ غور کے تال ادب کی کمانی میں جھک رہے ہیں۔ نگاہیں کہاں سے کہاں پہونچتی ہیں۔ کہتا ہے ؎

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان — ہر باغ میں، ہر دشت میں، ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں، بارنگ میں، نیرنگ میں پہچان — منزل میں، مقامات میں، فرسنگ میں پہچان
نت روم، رنت ہند میں، اورنگ میں پہچان — ہر راہ میں ہر ساتھ میں ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم و ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان — ہر دھوم میں، ہر صلح میں، ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں، ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

اسکا ایک اور بند ملاحظہ ہو ؎

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغل مار — کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سما چار
پہونچا ہے کوئی پار، بھٹکتا ہے کوئی وار — بیٹھا ہے کوئی عیش میں، پھرتا ہے کوئی خوار
عاجز کوئی بے کس، کوئی ظالم، کوئی لٹھ مار — مفلس کوئی، ناچار، تو انگر کوئی زردار
زخمی کوئی مانداکوئی، اچھا کوئی بدکار — جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں سب اسرار

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

اسی مسلک "ہمہ اوست" پر نظیر زندگی بھر جمے رہے، دونوں مذاہب کے پیرو، ان کا احترام کرتے اور ان کے کلام کی قدر کرتے تھے۔ پروفیسر شہباز نے مرحوم کی نواسی سے ان کے مذہبی عقائد کے بارہ میں بتایا کہ اگرچہ وہ شیعہ عقائد رکھتے تھے، لیکن کسی فرقہ والے سے جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ صلح کل آدمی تھے۔ تعزیہ داری بھی کرتے تھے اور اپنے زمانہ کے مشائخ سے خاص ربط رکھتے تھے، ہندوؤں کے یہاں معلمی کے سلسلہ میں ملازمتیں کیں اور ان کی فرمائش پر کنھیا جی کے جنم، اور مہادیو وغیرہ کے بیاہ پر معرکہ الآرا خلوص میں ڈوبی ہوئی، نظمیں لکھیں جو ہندو عوام میں بہت مقبول ہوئیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مزاج میں تعصب نام کو نہ تھا۔

آگرہ میں ایک بزرگ حضرت میر ابو العلا کا مزار ہے۔ ان کا عرس نویں صفر کو ہوتا ہے اُس عرس میں نظیر نہایت پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ یہ تحقیق نہ ہو سکی کہ خود وہ کسی کے مرید ہوئے تھے یا نہیں۔ تاہم یہ بالکل ثابت ہے کہ اُن کا دل خوش عقیدگی سے معمور تھا اور بزرگوں کے فیض صحبت اور جذب ارادت کے باعث وہ صاحب نسبت ہو گئے تھے اسلیے تصوّف کے رنگ میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ اہل دل کو تڑپا دیتا ہے۔

نظیر کو موسیقی سے بھی خاص لگاؤ تھا، بقول حضرت شہباز:۔

"نظیر کے ہر فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا کن رسیا تھا"

شعراء کے لیے موسیقی سے کچھ نہ کچھ مناسبت طبع بہر حال ضروری ہوتی ہے، لیکن نظیر کے کلام سے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ اور ماہر موسیقی دانوں میں سے تھے، اپنے کلام خاص مواقع کے لیے وہ الفاظ بھی ایسے لاتے ہیں اور ان کو اس طرح ترکیب دیتے ہیں کہ نظم میں موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ خاص طور سے جہاں جہاں انھوں نے گانے بجانے اور بزم نشاط کی دھومیں کا نقشہ کھینچا ہے، وہاں ان کا یہ کمال خصوصیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس زمانہ کا ایک مشہور

کلانوت تخلص بہ موج اور اس کا بیٹا لہر، دونوں نظیر کے شاگرد تھے، اور اپنے تصنیف کردہ گیتوں اور شعروں پر میاں نظیر سے اصلاح لیتے تھے۔ نظیر کی بہت سی غزلیں ان دونوں باپ بیٹوں کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ یہ لوگ عموماً نظیر کی ہدایت کے مطابق یا بطور خود ان کی غزلوں کی دھنیں مقرر کر کے نہایت دلفریب انداز میں گاتے اور ان کا شہرہ فوراً تمام شہر میں ہو جاتا۔

# نظیر کی تصانیف

نظیر نہایت پرگو شاعر تھے۔ غیر معمولی قوی دماغ پایا تھا۔ نظر انتہائی تیز اور دور رس تھی اور خیالات میں حد درجہ وسعت تھی۔ اپنے زمانہ کی تمام اچھی بری سوسائیٹیوں کو خوب اچھی طرح چھان ڈالا اور سب ہی پر مفصل طبع آزمائی کی۔ عمر بھی تقریباً نواسی سال کی پائی، نہ معلوم کتنے اشعار کہہ ڈالے، لیکن وارفتہ مزاجی کے باعث کلام جمع کرنے اور اُسے مرتب کرنے کا اہتمام نہ تھا۔ نہ معلوم کتنا کلام ضائع ہو گیا۔ نہ معلوم کتنا کلام دوسروں کو بخشدیا۔ فقیر آتے صدائیں لکھوا لے جاتے، چھوٹے بچے آتے، اور فرمائش کے مطابق اشعار لکھوا کر لے جاتے۔ تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ان کا کلیات جو اولاً چھپا، وہ ان کے دو ہونہار شاگردوں ایک ہندو رئیس بلاس رائے کے لڑکوں کی بدولت چھپا۔ روایتوں میں ہے کہ نظیر کو اس رئیس کے یہاں معلمی کی تنخواہ ستر روپیہ ماہوار ملتی تھی، یہ لڑکے اُستاد سے پڑھتے بھی اور کلام بھی جو کچھ ملتا، بیاض میں لکھتے جاتے۔ کلام جس قسم کا بھی ہوتا، اُسے وہ بلا استثنا جمع کرتے۔ سب سے پہلے یہ کلیات مطبع الٰہی کنبوہ دروازہ میرٹھ میں شائع ہوا۔ لیکن یہ سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں کہ نظیر کا کلام کُل اتنا ہی تھا۔ اس لیے کہ اُس کلیات میں غزلوں کی تعداد چالیس سے زائد نہیں۔ نظیر کے ایک دُور کے عزیز اور ادب اُردو خصوصاً کلام نظیر سے خاص ذوق و شغف رکھنے والے مرزا نوازش علی بیگ کے بیان کے مطابق، غزلیات نظیر پورے ایک دیوان کی شکل میں ردیف وار مرتب تھیں۔ قطب الدین باطن (صاحب تذکرہ گلستان بے خزاں)

نے نظیر کے اشعار کا اپنے تذکرہ میں جس طرح انتخاب کیا ہے، اُن سے بھی اس دعوے کا اثبات ہوتا ہے۔

متذکرۃ الصدر کلیات کا دوسرا اڈیشن سنہ ۱۸۸۲ء میں مطبع احمدی چارسو دروازہ میرٹھ[1] میں شائع ہوا۔ اس میں اور مطبع الٰہی والے اڈیشنوں میں کلام کے فحش اور مبتذل حصّے بھی شامل تھے۔ اس کے بعد اُردو کے خزائن نایاب کو دستبرد فنا سے بچانے میں سب سے اول رہنے والے مطبع نامی منشی **نولکشور** لکھنؤ نے اسے اپنے یہاں انتہائی نفاست کے ساتھ شائع کرایا، لیکن اس کے وہ اشعار جو فحش سمجھے جاتے تھے خارج کر دیے۔ مطبع نولکشور کے اس اڈیشن میں ذیل کی رائے مصحح کتاب سید تصدق حسین صاحب کے قلم سے درج ہے:۔

"مصنف باکمال نے ہزاروں طرح کے پند و نصائح کو چٹکلوں اور مثالوں میں نظم فرمایا ہے۔ خواب غفلت سے دنیا کی میٹھی نیند سونے والوں کو کس کس حسن ادب سے جگایا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اگلے لوگوں کا کلام بھی عجب پُرتاثیر ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر وقت میں اس کا مداح صغیر و کبیر ہے۔ یہی کلیات ہے کہ اگر چشم ظاہر سے اس کو دیکھو تو طرح طرح کی دل لگی کی باتوں اور مذاق کی حکایتوں سے مملو ہے، اور اگر دیدۂ حق بیں سے بغور و تامل ملاحظہ ہو، تو سراسر دنیائے ناپائیدار کی مذمتوں اور چرخ کج رفتار کی شکایتوں کا دریا گویا بہ سُبو ہے۔"

مطبع نولکشور کا یہی اڈیشن عام طور سے ملتا ہے، سنہ ۱۹۰۰ء میں نظیر کو قعر گمنامی سے نکالنے والے اور ورطۂ بدنامی سے نجات دلانے والے ادیب سحر طراز مولوی سید محمد عبد الغفور شہباز پروفیسر اورنگ آباد کالج نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے ایک اور کلیات نظیر مرتب کر کے مطبع نولکشور سے شائع کرائی (پروفیسر شہباز کی مرتب کردہ نظیر کی سوانح عمری "زندگانی بے نظیر" بھی اسی مطبع نے شائع کرائی) اس کلیات کے علاوہ نظیر کے تین مکمل دیوان اور تھے، دو اُردو میں ایک فارسی میں۔

[1] پروفیسر شہباز نے اس مطبع کو آگرہ کا مطبع سحر لکھا ہے لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ نے دیوان نظیر کے مقدمہ میں اسے میرٹھ میں قرار دیا ہے ۱۲ اشرف علی

ان اُردو دیوانوں کی غزلوں کا انتخاب، باطن کے تذکرہ گلستاں بے خزاں میں ہے، لیکن فارسی کا دیوان لاپتہ ہے۔ اس کے نمونے پروفیسر شہباز نے اپنی مرتب کردہ کلیات نظیر میں دیے ہیں اُنھوں نے زندگانی بے نظیر میں لکھا ہے کہ مرزا نوازش علی بیگ صاحب نے ان سے اس فارسی دیوان کا ذکر کیا تھا اور جب انھوں نے طلب کیا تو مرزا صاحب نے کہا کہ میرے ایک عزیز اُردو اور فارسی دونوں دیوانوں کو گوالیار لے گئے ہیں وہاں سے منگوا کر حاضر کروں گا لیکن یہ وعدہ وفا نہ ہوا۔

اُردو کے مشہور فرانسیسی محقق گارساں دی تاسی نے لکھا ہے کہ نظیر کا دیوان سب سے پہلے ۴۰۴ صفحات پر ۱۸۲۰ء میں لیتھو کے ذریعہ ناگری حروف میں شائع ہوا، جس کے ٹائیٹل پر میاں نظیر کی تصویر بھی تھی، اور پھر ۱۸۵۰ء میں ان کا دیوان نستعلیق خط میں خاص آگرہ سے شائع ہوا، جسے خود نظیر نے مرتب کیا تھا۔ لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی (جنھوں نے ۱۹۴۲ء میں نہایت اہتمام کے ساتھ دیوان نظیر مرتب کرکے انجمن ترقی اُردو ہند کے زیر اہتمام چھپوایا) گارساں دی تاسی کے اس بیان کو غیر صحیح قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس نے جن دیوانوں کے انطباع کا ذکر کیا ہے وہ دراصل دیوان نہیں، کلیات تھے۔ جن میں صرف غزلیں نہیں بلکہ ہر قسم کے اشعار تھے۔

اُردو کے یہ دونوں دیوان، انجمن ترقی اُردو کے اس ۱۹۴۲ء والے اڈیشن میں شامل ہیں، اور ان کی ترتیب و تہذیب و تصحیح میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے بڑی ہی محنت کی ہے۔ یہ وہ نایاب دیوان ہیں، جن کی تلاش میں پروفیسر شہباز عمر بھر سرگرداں رہے اور بالآخر ان لفظوں میں ناکامی کا اعتراف کر گئے:۔

"ورثا میں تحریک کی گئی، لیکن ان کیمیا گروں کو اس نسخے کی اشاعت منظور نہیں ..... باضابطہ دیوان اس کا ابھی تک خاندان کے بعض تنگ خیال لوگوں کے خلوت خوش خیالی میں بند ہے۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ کو یہ دونوں دیوان جس طرح ملے، اس کا حال اُنھوں نے دیوان نظیر شائع کردہ انجمن ترقی اُردو (مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی) میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے

اور اُس کے آغاز میں یہ برمحل شعر چسپاں کیا ہے ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال  کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یہ دیوان مرزا فرحت اللہ بیگ کو آغا حیدر حسن دہلوی پروفیسر نظام کالج حیدرآباد (دکن) (جو ایک زمانہ میں نسوانی زبان کے اُردو رسائل میں مضامین لکھنے کے لیے مشہور تھے) کے یہاں اتفاقاً ہاتھ لگے، اُنھیں ایک مضمون لکھنے کے سلسلہ میں کلّیات نظیر (شہباز اڈیشن) کی ضرورت تھی، چونکہ آغا صاحب پُرانی کتابوں کے جمع کرنے کے بڑے شائق تھے، یہ انھیں کے یہاں اسکو دریافت کرنے گئے، انھوں نے کہا کہ وہ کلّیات تو نہیں، ہاں ایک قلمی دیوان ہے۔ دیکھتے ہی مرزا فرحت اللہ بیگ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں:۔

"یا میرے اللہ، یہ وہ دیوان ہیں جن کی تلاش میں پروفیسر شہباز نے تمام ہندوستان چھان مارا اور نہ ملے۔ تذکرہ نویسوں نے ان دیوانوں کا ذکر تو کیا، مگر سوائے باطن کے اور کسی کو انکا دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔"

یہ دونوں دیوان آغا حیدر حسن خاں کو اُن کے نانا عبدالرحمٰن خاں دہلوی المعروف بہ استاد احسان دہلوی کے کتب خانہ سے ملے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہوشربا ہنگامہ میں ان کا کتب خانہ غارت ہوا تھا، حسن اتفاق سے جو چند کتابیں بچ گئیں، ان میں یہ دونوں دیوان بھی تھے۔ یہ دیوان نہایت نفیس کشمیری کاغذ پر ہیں، اور ان کے شروع میں نظیر کی تصویریں، اور شروع میں وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے ہندوؤں کے اوتاروں کے بارہ میں لکھی تھیں، اور ان دیوانوں میں نظموں کے لحاظ سے بعض لاجواب تصویریں بھی تھیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا قیاس ہے کہ یہ دیوان نظیر کے کسی امیر ہندو شاگرد کے پاس تھے، اگر راجہ بلاس رائے کے لڑکوں کے پاس ہوتے تو جس طرح انھوں نے کلّیات چھپوائی، ان دیوانوں کو بھی ضرور چھپواتے۔ نظیر کے امیر ہندو شاگردوں میں مہاراجہ بلونت سنگھ المتخلص بہ راجہ بھی تھے لہذا ان دیوانوں کو انکی ملک سمجھنی چاہیے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے نزدیک ان کے مرتب کردہ دیوان نظیر میں نظیر کی ساری غزلیات آ گئیں، لیکن جناب مخمور اکبر آبادی صاحب "روح نظیر" نے روح نظیر کے دوسرے اڈیشن مطبوعہ سنہ ۱۹۴۶ء میں اس رائے کو ذیل کے وجوہ سے غلط ٹھہرایا ہے۔

(۱) ضیائے عباسی ہاشمی ضیائی بدایونی والا نسخہ، جس سے صاحب روح نظیر نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، بہت سی ایسی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے جو کہیں اور نہیں ملتیں۔

(۲) مولوی عابد علی صاحب (شاہ گنج ۔ آگرہ) نے کلام نظیر کا جو ذخیرہ مرتب کیا ہے، اُس میں اس کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔

(۳) اسی طرح منشی درگا پرشاد مہر ایڈوکیٹ و رئیس پنی گلی آگرہ کے پاس بھی، نظیر کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ پنڈت کیلاش ناتھ کنزرو وکیل سرکار و رئیس اکبر آباد کے قبضہ میں بھی بہت سا غیر مطبوعہ کلام نظیر تھا جن کا بڑا حصہ پورے دیوان حافظ کی تضمینوں پر مشتمل تھا۔

(۵) سہارن پور کے ایک ایڈوکیٹ بابو رام گوپال کے پاس بھی کچھ غیر مطبوعہ کلام محفوظ بتایا جاتا ہے، یہ اسی کھتری خاندان سے ہیں جہاں میاں نظیر پڑھانے جایا کرتے تھے

(۶) مولوی عابد علی صاحب (شاہ گنج آگرہ) کے قول کے مطابق بندرابن کے کسی حلوائی یا کنجڑے کے پاس نظیر کا اچھا خاصہ غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

(۷) نظیر کی جانب منسوب بہت سا کلام لوگوں کو زبانی یاد ہے، جو قید تحریر سے آزاد اور سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے، کلام نظیر کے ان حافظوں میں پھیری کرنے والے گداگر، قلندر، خوانچہ والے "چنا جور گرم" بیچنے والے وغیرہ شامل ہیں۔

## تصانیف نثر

نظیر اکبر آبادی نے نثر میں، جو کچھ لکھا، فارسی میں لکھا، صرف ایک چھوٹی سی کتاب

اُردو انشا میں بھی لکھی ہے جس کا نام فہم قرین ہے۔ یہ دستور الصبیان کی وضع کی مختصر سی کتاب ہے، اور اس میں مبتدیوں کے لیے آسان عام فہم عبارت میں رقعات لکھے گئے ہیں۔ صرف ایک رقعہ کی عبارت میں کسی قدر رنگینی نظر آتی ہے۔ یہ رقعہ مرشد، باپ، چچا، خالو، ماموں پھوپھا۔ بھائی اور ماں کے نام ہیں۔ ان کا مقصود، مبتدی طالب علموں کو خط و کتابت سکھانا ہے، ان میں عام القاب، آداب، خط کے شروع کرنے اور ختم کرنے کے اُس زمانہ کے مروّج طریقے درج ہیں، اُن کے مضامین میں روزمرہ کام آنے والی چیزیں مثلاً تقاضائے خرچ۔ ارسال زر، طلب خیریت، تلاش روزگار، معذرت وغیرہ شامل ہیں۔

نثر فارسی میں بقول باطن انھوں نے نو نثریں لکھی تھیں۔ لیکن پروفیسر شہباز کو صرف پانچ کی زیارت ہوئی۔ ان میں سب سے بہتر بزم عیش ہے جس میں اُنھوں نے آگرہ کے میلوں کو خوب تفصیل سے لکھا ہے، ان میلوں کا حال تفصیل کے ساتھ ان کے منظوم کلام میں بھی ہے۔ یہ نثریں چھپیں نہیں، ان کے قلمی نسخے شہباز صاحب کی نگاہ سے گذرے تھے ان کے دیکھے ہوئے ایک نسخہ کے بارہ میں اُن سے یہ بتایا گیا کہ یہ خود میاں نظیر نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، لیکن پروفیسر شہباز اس کو اس بنا پر صحیح تسلیم نہیں کرتے کہ کتاب میں ایسی فاش غلطیاں موجود ہیں جو مصنف کے قلم سے سرزد نہیں ہو سکتیں۔

نظیر کے شاگرد میاں باطن نے ان نثروں کے بارے میں یہ لکھا ہے:۔

"جس وقت مزاج عالی، تحریر نثر پر ملتفت ہوا، مضمون انشاہائے رنگین گزیں قدرتین۔ فہم قرین۔ بزم عیش۔ رعنا زیبا۔ حسن بازار۔ طرز تقریر وغیرہ نو عدد مثال نورتن، زیب بازوئے شاہد مدعا ہو کر دست بستہ آن پہونچا۔"

فارسی نثر کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ شریفہ نامی پھل کا ذکر ہے:۔

"شوخے لطیفہ پرداز شریفہ طلبید۔ چوں پیش رسید، گفتم شریف تر گردید۔ گفت دلت بکفایت دوید۔ گفتم جائے کہ بہتر و زود تر رسد شرف باید گردید۔

وحصول دو فرحت باید گردانید۔ یکے شریفہ و دیگر لطیفہ۔ عنایت کرد و گفت
دلت خوش گردید۔ گفتم وقتے کہ از دست ناز خواہد رسید" ؎

چوں ز دستِ ناز ہم آمد بدست
گفتم اکنوں خاطر من شاد شد
(طرز تقریر ۲۳)

جامن نوش کیجیے:۔

"نزد نازنینے رفتم۔ و گفتم جامن خوب تر آمدہ است ؎

گویم بے تکلف طرفہ جامن
تواں کردن بیانش تا کجا من

گفت بر و من خوش ندارم۔ رفتم و زود آوردم۔ قدرے بمن داد و گفت
دیگر۔ گفتم ہمیں ایں جامن۔ چوں خود تناول ساخت دو سہ تخمش بر من
انداخت۔ خوش وقت شدم و گفتم" ؎

ازیں جامن ہمینم آرزو بود
ز لطف نازنیں خوباں برآمد
(طرز تقریر ۲۴)

ہر چند آگرے کے آم بہت اچھے نہیں مگر میاں نظیر کے باغ کے ہیں:۔
مضائقہ نباشد

"در اصل انبہ کہ پسند خاطر خاص و عام ہست و شہد و شکر بے قدرے الیتام
پیش نازنینے رفتم۔ گفتم انبۂ ذائقہ فریب دیدہ آمدہ ام۔ گفت چرا نیاوردی
گفتم اکنوں چہ درنگ۔ مگر رنج انامل نزاکت شامل نہ شود۔ تبسم کرد و گفت
خوب۔ رفتم و زود آوردم۔ گفت چہ قسم است۔ گفتم ہمہ بہ ترشی در رشت۔
گفت اگر برآید۔ گفتم یک صفت۔ سرخ۔ سرخ روئی پسند و سرسبزی نگاہ
نیاز مند۔ و زرد ہم ایں کہ بخورند و روے گرفتنم زرد نہ کند۔ ہنگام تناول
ہماں قسم۔ گفت ہر چہ ازیں خوش آید باید گرفت۔ شیرہ گرفتہ گرفتم۔ گفت چرا۔

گفتم باطاعت۔ حکم ہمیں خوش آمد۔ بخندید۔ زیادہ مسرور شدم و گفتم ؎

لذتِ انبہ خوردن ایں طور
پیش من بہ ازیں نمی باشد
(طرز تقریر ۲۸)

اُس میوے کو بھی ملاحظہ کیجیے جس کی شان میں ہے۔ نہ انجیر نام ست ہر میوہ۔ جنت کے فواکہ سے ہے۔

"پیش محبوبے رفتم۔ دیدم کہ انجیر نہادہ است۔ و زلف گرہ گیر کشادہ۔ بقدر تفاوت نشستم۔ گفت اگر دل پذیر چندے ازیں بگیر۔ دانستم بعزم تسخیر۔ گفتم کجا ایں توقیر۔ اگر لطف است ہمیں جا عنایت تاثیر۔ گفت ایں چہ تقریر۔ گفتم از دور انجیر و نزدیک زنجیر۔ ترک انجیر از بیم زنجیر۔ خوش تدبیر۔ گفت چناں۔ گفتم ؎

صید رم دارد و صیاد فسوں می خواند
ہر کسے مصلحتِ خویش نکو مے داند
(طرز تقریر ۲۹)

سیب کا مزہ بھی چکھتے چلیے:۔

"نزد نازنینے سیمیں ذقن رفتم و گفتم سیب خوش رسیدہ است۔ گفت بیار۔ گفتم از دستم بہ سیب رسد۔ گفت بے آسیب نہ خواہد رسید۔ گفتم اگر باغباں نداند۔ گفت پاسبان زلف اسیر گرداند۔ برائے آں کہ دیدن و چیدن تفاوت دارد۔ گفتم چساں۔ گفت در دیدن بہی و در چیدن الہی۔ آوردم۔ ہنگام تناول پسند ساخت و دو ہانم را نیز معزز فرمود۔ مسرور شدم گفتم ؎

خوردن سیب از چنیں خوبی
غیر لطف بتاں نہ می باشد

(طرز تقریر ۳۳)

نثر کے یہ نمونے حضرت شہباز کی مہربانی سے "زندگانی بے نظیر" کے صفحات میں محفوظ رہ گئے ہیں۔

حضرت نظیر کے کلیات کا یہ نیا ایڈیشن، ادیب فاضل، شاعر سخن فہم و سخن سنج مولوی عبدالباری آسی نے بکمال محنت و دیدہ ریزی مرتب کرنا شروع کیا تھا، لیکن قبل اس کے کہ کام تکمیل کو پہونچے، داعی اجل کو لبیک کہی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ اگر زندہ رہے ہوتے تو کلیات میر، و کلیات آتش وغیرہ کی طرح کلیات نظیر پر بھی بے نظیر محققانہ مقدمہ و تبصرہ تحریر کرتے لیکن اُردو زبان کی بدقسمتی کہ وہ اس سلسلہ میں بلا ایک سطر لکھے اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے، اور یہ کام برادر محترم جناب مولوی سید جعفر علی صاحب نگینوی فاضل دیوبند و مصحح مطبع ہذا کے سپرد ہوا لیکن قدرت نے اُن کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو ہر جاندار کے لیے ایک نہ ایک دن درپیش ہوگا بالآخر یہ کام مجھ جیسے نااہل و نافہم کے ذمہ ڈالا گیا۔

آخر میں عالیجناب معلّی القاب راجہ رام کمار و تیج کمار صاحبان مالکان مطبع منشی نولکشور ویکٹیشور کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ اُنھوں نے اُردو، عربی اور فارسی کتابوں کی اشاعت کے بارہ میں اپنے بزرگوں کی شاندار روایات کو ایک بار پھر زندہ کر دیا۔ ان کی علم دوستی اور ادب نوازی، جس کے ضمن میں کلیات نظیر کا یہ نیا اڈیشن جس میں وہ تمام غزلیں اور نظمیں جو اب تک دستیاب نہ ہوئی تھیں یا غیر مطبوعہ تھیں شامل کر دی ہیں) بھی شائع ہو رہا ہے، جو صفحات تاریخ میں ہمیشہ یادگار اور ضرب المثل رہے گا۔

احقر

ابوالخیر محمد اشرف علی لکھنوی

(۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء)